حضور ﷺ بحیثیت معلم

نعیم صدیقی

حضورؐ بحیثیت معلّم

آغاز، خداوند علیم وحکیم کے نام سے جو اپنی پیدا کردہ ہر مخلوق کے لیے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر معین کرتا ہے اور اس کے لیے راہ ہدایت کی نشان دہی کرتا ہے..... جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علم الاسماء کے اعزاز سے نوازا، اور جو تمام انسانوں کے لیے اولین معلم حقیقت و ہدایت ہے۔

صدہا سلام اس نسان عظیمؐ پر، جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر ونذیر بنا کر اٹھایا گیا، اور ساری انسانیت کے لیے معلم فلاح وسعادت کے منصب پر قیامت تک کے لیے مامور کیا گیا۔ وہ کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ سرزمین حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلمؐ صدق وصفا سے درس لینے والی تہذیب نا آشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوام عالم کے لیے نہ صرف راستی، مساوات، عدل، اخوت، احسان اور امن کی رہ نما بن گئی بلکہ اس

نے تدبر و تفکر کی کنجیوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوع انسان کے لیے کھول دئے۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ ہی کی تیار کردہ جماعت نے بین الاقوامی تہذیب کا افتتاح کیا، اور آج کے فاسد علوم اور بے توازن تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابل قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسی قوم محمدؐ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سراغ گم کر بیٹھی۔

اصل مبحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساس ندامت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ملت اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبی پاکؐ جیسے عظیم ترین معلم ایمان و عمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری و عملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے۔ اپنے کاروان حیات کو ہر پیچ و خم تاریخ سے گزارتے ہوئے حضورؐ کا دامن قیادت تھامنے اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبہ ہائے کار میں حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے۔ مگر ہماری افسوس ناک حرکت یہ ہے کہ ہم اس ہستی کو جو قائدِ تہذیب انسانی تھی، ایک آراستہ و پیراستہ عجائب خانۂ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلہ ہائے فکر و عمل کو وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ بحران زدہ تہذیب کے بدراہ اور پراگندہ فکر اکابر کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لیے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے افق پر ابھرنے والے نت نئے ''آفلین'' کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصود نظر پھر جب جگنو کی سی چمک دکھا کر، آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے، تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اس پر مر مٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی ٹھنگنی اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے، جب تعلیم بھٹک جاتی ہے، جب مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے، اور جب معلم اپنا فریضہ اور پارٹ صحیح طور سے ادا نہیں کرتا۔ علم اور تعلیم بھٹکتے ہوئے خورشید و مہ کے پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے، نہ جمہوریت نشو نما پا سکتی ہے، نہ اقتصادی عدل قائم ہو سکتا ہے، نہ اخلاقی شعور اتنا زوردار ہوتا ہے کہ جرائم کا راستہ روک سکے، نہ قومی خودی اس حد تک توانا ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دفاعی، سفارتی اور نشری قوتوں کو صحیح طور بروئے کار لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا، آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکتے ہوئے خورشید کے پرتو میں ۲۴ سال جادہ پیمائی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو بالکل ابتدا سے آہستہ آہستہ پرورش پا کر اب پوری

طرح جوان ہوگیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا سا وسیع کر کے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علوم وفنون، تنظیمات وادارات، ذرائع و وسائل اور تفریحات تعیّشات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دوچار ہے۔ جنگوں، انقلابات، قومی وطبقاتی تعصّبات، طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور منحوس قسم کے خونخوارانہ اور جرائم کے ہجوم میں کھڑا ہوا بے بس انسان دل ودماغ کا سارا سکون گنوا کر ہم دردی کے ایک مخلصانہ بول کے لیے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی اور عالمی لحاظ سے بھی زندگی کو سنوارنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ اسی کی درستی پر ہماری اپنی سلامتی کا بھی انحصار ہے۔ اور اسی کو صحیح اصول ومقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فساد بحر وبر میں مبتلا دنیا کو امن وانصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

میرے مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کی درستی کے لیے حضور خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید ارشادات و نکات اخذ کر سکیں۔

حضورؐ کے معلمانہ کارنامے پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہوگی جب تک ہم اس حکمت علم اور حکمت تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق

حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

ہماری حکمت علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع حصول کیا ہیں؟

ان سوالوں کو چھیڑتے ہوئے جب ہم مغرب کے THEORY OF KNOWLEDGE کو دیکھتے ہیں تو پھر پیروان محمد ﷺ اور حاملین قرآن کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑ کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزا ہیں وہ غلط افکار و تصورات کے ساتھ اس بری طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے ذریعے زندگی کو پوری طرح خیر و خوبی سے آراستہ کرنا ناممکن ہے، اور جو نظام تعلیم محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ بن کے رہ گیا ہو، وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کر سکتا ہے، اور نہ انسانیت کو موجودہ بحرانی دور سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کی رو سے حقیقت صرف وہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے باہر خواہ کتنے ہی بڑے حقائق موجود ہوں، ہمارے لیے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا جس شکل میں سمجھتے ہیں جان لیتے ہیں۔ اس مرحلے میں وہی کچھ حقیقت ہے، بعد میں اگر کوئی نئی معلومات

پچھلے مسلمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریۂ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایۂ علم کسی بھی مرحلے میں، ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہو سکیں کہ فی الجملہ ہم نے صحیح عمارت اٹھائی ہے، اور اب مزید معلومات و تجربات کی مدد سے اسے بنانے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیر حیات کے عمل میں قابل اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کی تحریکیں، آج کے سماجی نظام، آج کے معاشرے اس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحل سمندر کی ریت سے بناتے ہیں، پھر اپنے حاصل محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دوہراتے ہیں۔ غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے میں اس حکمت علم پر مثبت گزارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے سامنے رکھا۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیر بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدار گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی

میں انسانی رابطوں، رویوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبی پاکؐ نے بہ حیثیت معلّم انسانیت ہمارے سامنے اولین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علم کامل صرف خدا کو حاصل ہے، وہی کائنات کے اسرار و رموز کا جاننے والا، ظاہر و پنہاں سے آگاہ، اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اسی کا عطیہ ہے۔ انسان جو محدود ذرائع علم حاصل ہیں، وہ اسی کے عطا کردہ ہیں۔ سماعت، بصارت اور تفکر کی قوتیں اسی نے دی ہیں، انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے انکشاف سمیت بہت ہی محدود ہے۔ خدا کے علم کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علم قلیل کی محدودیت کا اندازہ ہو جائے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلب علم پیدا ہوگی، اور دوسرے وہ علم کامل کے سرچشمہ سے استفادہ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا اور اس سے استفادے کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحب علم کامل اور اس کے زیر تعلیم متعلم کے درمیان بروئے عقل موجود ہونا چاہیے۔ اپنے علم کی محدودیت کا شعور انسان کو اس جسارت بے جا سے بھی روکنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر نت نئے نظاموں اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور غیر متوازن ڈھانچے کھڑے، ان پر اندھا دھند انسانی

قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کرے، اور پھر وہ یکے بعد دیگرے خوفناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہیں۔ حضورؐ کی حکمت علم انسان کو یہ بتاتی ہے کہ انسانی علم کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا پارٹ ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان بندگی و نیابت کے مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیر ہدایت کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

علم قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے، بلکہ حسی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دوسرے ذریعہ علم کا بھی سراغ لگائے جو تعمیر حیات کے لیے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ پس انسان ایک لامتناہی وادیٔ علم کا مسافر ہے جس کے لیے کمر کھولنے کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافہ علم کی دعا جذبۂ طلب علم کو متحرک رکھنے کے لیے سکھائی گئی ہے۔

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمت تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافر علم کے سامنے کچھ نشانات راہ ضرور واضح ہوں، اس کے پاس کچھ نہ کچھ زاد راہ بھی ہو، اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبی اکرم ﷺ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کی رو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی

صحت کا دارومدار ہے۔

ان میں سے اولین حقیقت عظمیٰ (SUPREME REALITY) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمت علم کی بنیاد تصور خدا پر ہے۔ اس کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے۔ وہ اگر صحیح روش پر چلے تو اس کے لیے خلافت و نیابت کا درجہ بلند ہے۔ اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تمیز خیر و شر دی گئی ہے۔ بنابریں وہ ذمے دار اور جواب دہ ہے۔

تیسری بڑی حقیقت مادی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی، وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے۔ وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے۔ اس کی ایک غایت ہے۔ اس میں نظم و ترتیب ہے۔ اس میں ہر چیز اٹل قوانین میں جکڑی ہے۔ اس میں توازن ہے۔ اور اس میں حسن و زیبائی ہے۔ پوری کائنات ایک ہی کل ہے۔ جو ایک ہی قوت کے زیر فرمان چل رہی ہے۔ اس کائنات کی تمام مادی اشیا اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو، اس کے لیے ''متاع'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان سے وہ بحیثیت نائب الٰہی فائدہ اٹھانے اور ان کو حدود اللہ کے اندر رہ

کر استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ کائنات مادّی کے موجودات اور ان کی قوتوں سے کام لینے کے لیے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اس علم کو حضورؐ نے علم ابدان قرار دیا ہے۔ یعنی وہ علم جو مجسم موجودات — نامی و غیر نامی — اور ان کی قوتوں اور ان کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

ان سہ گانہ حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالب علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے آتے ہیں۔ ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ، دوسرا امور غیب کا دائرہ۔ اور امور غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور ان تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں دیا گیا۔ لیکن ہم امور غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی نہیں چل سکتے۔ ہر فرد انسانی چند نمایاں سوالات سے دوچار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؟ یہ زندگی ایک وقتی ظہور ہے یا جیسے کچھ نتائج فوری پر پا لیتے ہیں۔ بس معاملہ ان ہی پر ختم ہے یا کسی قاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان کے صحیح اور مکمل نتائج ملنے ہیں؟ زندگی کا معاشی اور جنسی کامرانیوں سے بلند تر بھی کوئی مقصد ہے؟ ان سوالات کا جواب طے کئے بغیر زندگی کی سرگرمی کو حسن و خوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص اثباتاً نہیں تو نفیاً، شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری طور پر، باقاعدہ استدلال نہیں تو ظن و تخمین سے ان سوالات کے جوابات طے کرتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کرتی ہے۔

ان امور غیب کے متعلق انبیا وحی والہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ الہامی رہ نمائی کو پیش کرنے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت شاید مفید ہوگی کہ تاریخ کے مطالعے میں اسلامی حکمت علم جس چیز پر ہماری توجہات کو مرتکز کرتی ہے وہ سنۃ اللہ اور امر اللہ ہے۔ اس سنۃ اللہ اور امر اللہ کے زیر عنوان آنے والے قوانین و نوامیس میں زیادہ جامع بدیہی اور اساسی ہیں، ان کی تصریح مثالوں کے ساتھ قرآن نے کردی ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ کر کے شواہد دریافت کئے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح مطالعۂ کائنات کے سلسلے میں قرآن کی ایک اصطلاح بہت اہم ہے اور وہ ہے ''آیت'' جس طرح آیات قرآن علم حقیقت اور علم حوادث سے بہرہ مند ہونے کے لیے ہماری رہ نما ہیں، اسی طرح مادّی کائنات میں پائے جانے والے تمام مظاہر تلاش حقیقت کے سفر میں ہمارے لیے نشانات راہ ہیں اور ان پر بھی آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ کائنات کی آیات سے ایک فلسفی اور ایک سائنس داں یکساں استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان آیات میں جمال کا جو پہلو پایا جاتا ہے، اس سے ادیب، شاعر، مصور، اور جملہ فنون لطیفہ کے وابستگان بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس اشارے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کائنات کی آیات اور

تاریخ میں کام کرنے والے نوامیس الہامی تعلیم کی آیات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ہم آہنگی الہامی تعلیم کی صحت وصداقت کے لیے ایک موثر عقلی دلیل قرار پاتی ہے۔

اس الہامی ذریعہ علم سے ہمارے حسی و قیاسی ذرائع حصول علم کی کوتاہی کی تلافی ہوتی ہے اور ہمیں ایسے یقینیات حاصل ہو جاتے ہیں جن پر انفرادی کردار اور اجتماعی تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہ الہامی یقینیات نظام تمدن میں اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں، جیسے ریاضی میں دو اور دو چار کا فارمولا ہے۔

نبوت جہاں ہمیں بعض تفصیلی احکام و قوانین اور حدود و شعائر کا سرمایہ فراہم کرتی ہے وہاں اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں ''العلم'' (THE KNOWLEDGE) یا اساسی علم Basic knowledge بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں مرکزی حقیقت عظمیٰ Great Central Reality کا شعور ملتا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں رہ نما اصول حیات Guiding Principles اور بنیادی صداقتوں Basic Realities نیز مستقل اخلاقی قدروں Perma Moral Values کی دولت نایاب ہاتھ آتی ہے، اس قسم کے اٹل یقینیات کو قرآن ثابت قرار دیتا ہے کہ جو کردار اور تہذیب کی اساس کے طور پر اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ ان اساسی حقائق و قوانین کے چوکھٹے میں دیگر تفصیلی ضوابط ترتیب پاتے ہیں۔

یہی وہ علم ہے جسے ورثۃ الانبیا قرار دیا گیا اور یہی وہ علم ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ورنہ اگر یہاں علم سے مراد جملہ اقسام کے علوم لیے جائیں تو پھر ہر مسلمان پر لازم ہوگا کہ وہ روئی دھننے اور چمڑے کی دباغت کرنے سے لے کر انجینئری اور ڈاکٹری اور جوہری توانائی اور خلائی پرواز تک سارے علوم حاصل کرے اور نہ کر سکے تو ترک فرض کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ فی الحقیقت سارے کا سارا قرآن اسی ''العلم'' کا آئینہ دار ہے اور نبی اکرم ﷺ نے بہ حیثیت معلم کتاب وحکمت اصل زور اسی العلم کو پھیلانے پر صرف کیا ہے۔ اس کی مختصر جامع تعریف حضورؐ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

''وہ علم جس کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔''

(روایت ابو ہریرہ، مشکوۃ کتاب العلم)

علم کا آخری مقصد کیا ہے؟ قرآنی اصطلاحات کے مطابق اس سوال کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ علم حق کے ذریعے عمل صالح کا حصول، اعمال صالحہ سے حیات طیبہ کی تشکیل اور حیات طیبہ سے نفس مطمئنہ کے مقام تک رسائی علم کا مقصود ہے۔

اگر ذرا اور اجمال سے کام لیا جائے تو کہنا یہ چاہیے کہ علم کا کام یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، مفید اور مضر، نیکی اور بدی کو الگ الگ چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھ دے، تعلیم نبوت کا منتہا رشد وغیّ میں امتیاز

پیدا کر دینا ہے۔ نبی کی تعلیم کا فرقان ہونا لازم ہے۔

اسلامی حکمت علم کی پوری تفاصیل کو سمیٹنے کے لیے ایک مستقل مقالہ چاہیے۔ یہاں محض بیان کردہ چند نکات پر اکتفا کیے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ یہ غلط فہمی رفع کر دینا ضروری ہے کہ العلم کی متذکرہ اہمیت کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے طبعی عقلی علوم سے توجہ ہٹائی جائے جن کی مدد کے بغیر انسانی زندگی کی بہت سی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

قابل لحاظ بات صرف یہ ہے کہ ہمیں ''العلم'' کی اساس پر تمام علوم کو مدوّن کرنا چاہیے اور اپنے نظام تعلیم اور نصابیات کے لیے اسی کو محور بنانا چاہیے۔ یہ ہے تعلیمی انقلاب کا نقطۂ آغاز جس کو کار پردازان تعلیم نے اب تک نہیں سمجھا اور ہم ایک ناسازگار اور نامطلوب نظام تعلیم کے زنداں میں محبوس ہیں۔

حضور ﷺ ایک تعلیمی تحریک کے سربراہ تھے!

جب کبھی کوئی نبی اٹھتا ہے تو وہ ایک ہمہ گیر تہذیبی انقلاب اور ایک تعلیمی تحریک کا علم بردار بھی ہوتا ہے۔ حضور بھی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی لانے کے لیے دین حق کو لے کر مبعوث ہوئے اور عقائد و افکار سے لے کر احکام و قوانین تک ہر چیز کی تعمیر نو کا کام آپ کے سامنے تھا۔ اتنا بڑا کام انجام دینے کے لیے حضور معلم الناس ہی نہیں تھے، ایک وسیع تعلیمی

تحریک کے سربراہ بھی تھے۔

اسلام جس طرح دین ہدایت ہے، اسی طرح بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دین علم اور دین تعلیم و تعلم بھی ہے۔ جس دین کا آغاز حکم "اقرأ" سے ہوتا ہو۔ جس کے اصل مخاطب "اولوالالباب" ہوں جس کے اسرار و رموز کو پا کر ایمان کے معیار کمال تک پہنچنے والے "الراسخون فی العلم" ہوں جو براہین پیش کر کے مخالفین سے بیّنات و براہین طلب کرتا ہو، جو تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتا ہو، اور جو سمع، بصر اور فواد سے کام نہ لینے والوں کو مویشیوں سے بدتر قرار دیتا ہو۔ جو کتاب الٰہی کا پشتارہ کندھوں پر لاد کر اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کو ایسے گدھے سے تشبیہ دیتا ہو جس پر علم کا دفتر لدا ہو۔ اس کے بارے میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ وہ اسلام کے لیے ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت رکھتا ہو۔

دین حق کی تعلیمی تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے حضورؐ کے لیے پورا معاشرہ کلاس روم تھا، اور آپ ذہنی و فکری لحاظ سے بھی تعلیم دینے والے تھے۔ اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے بھی فریضۂ تعمیر ادا کرنے والے تھے، سیاست و اقتصاد کے دائروں میں صراط مستقیم کی نشان دہی کرنے والے تھے۔ اور مخالف و مزاحم تخریبی قوتوں کے مقابلے میں جنگاہ کے اندر بھی کمان کرنے والے تھے۔ حضورؐ نے عملاً تعلیمی تحریک چلا کر توسیع علم کے لیے جو کام کیا اس کا بڑا نمایاں نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں تک حضورؐ کا

پیغام نہیں پہنچا ان کے اندر طلب علم کی اتھاہ پیاس پیدا ہوگئی اور جوں جوں دین حق پھیلتا گیا ہر قسم کی علمی ترقیات کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

نبی اکرم ﷺ کا معلمانہ منصب اور حکمت تعلیم

قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ حضورؐ کو معلم کتاب وحکمت اور مزکیؐ قرار دیا گیا ہے۔ حضورؐ خود اپنے آپ کو معلم قرار دیتے ہیں۔ مسجد نبوی میں بیک وقت آپؐ ایک طرف حلقۂ ذکر دیکھتے ہیں اور دوسری طرف مجلس تعلیم وتعلم، تو دونوں کا استحسان کرتے ہوئے مجلس تعلیم کو ترجیح دے کر اس میں جا شریک ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے رات کے تھوڑے سے حصے میں تعلیم دینے کو شب زندہ دارانہ عبادت سے افضل قرار دیا۔

آیئے ذرا ایک نظر اس تعلیمی حکمت پر بھی ڈالتے چلیں جس سے حضورؐ نے بہ حیثیت معلم کام لیا اور بعد کے معلمین کے لیے واضح نشانات راہ چھوڑ گئے۔ حضورؐ کی حکمت تعلیم کے نکات کو نمبر وار پیش کیا جا رہا ہے۔

(1) قرآن میں حضورؐ کے لیے معلّمانہ ذمے داری کو بلاغ مبین تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کر دینا ہر سچے مسلمان کی معلّمانہ ذمے داری ہے۔

(2) اوپر کے اصول کا دوسرا پہلو یہ کہ حضورؐ پر واضح کیا گیا کہ آپ مخاطب لوگوں کے لیے چوبدار یا جبّار نہیں بنائے گئے ہیں یعنی

معلمانہ کام کی روح محبت و خیر خواہی ہے۔ اس فریضے کو انجام دینے میں جبر و تشدد کی اسپرٹ راس نہیں بیٹھتی۔

(3) حضورؐ کو جو حکمت کی تعلیم سکھائی گئی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ معلم نرم خو ہو، تند خو نہ ہو۔ بہ صورت دیگر یا تو زیر تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر اسے کلاس روم میں بیٹھنے کا پابند کیا گیا تو کم سے کم طلبہ کے دل و دماغ ضرور کلاس روم سے فرار کر جائیں گے۔ حضورؐ نے خود اپنے رفقائے کار کو ہدایات دیں کہ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات نہ پیدا کرو، ان کو بشارت دینے والے بنو، نفرت دلانے والے نہ بنو۔

(4) حضورؐ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے خدا پرستانہ نظام حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نظام حیات کو چلانے کے لیے ایمان و کردار سے آراستہ لیڈر، افسر، کارکن اور شہری تیار کیے جائیں۔

(5) حضورؐ کی حکمت تعلیم ہمیں معلمانہ کام کا مشنری تصور دلاتی ہے، ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیم کا حق دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو

اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے، یہی اصول حضورؐ کا بھی تھا اور آپؐ نے اپنے تیار کردہ معلمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔

اس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلم کا کام کسی بڑھئی یا ترکھان یا آہنگری کی طرح کا پیشہ وارانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیے اس کے حسب منشا کام کر دیا۔ بلکہ یہ مشنری اسپرٹ سے کرنے کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں مخالفین اسلام یا منافقین کے لیے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ چناں چہ حضورؐ کا ایک ارشاد ہے کہ منافق میں تفقہ فی الدین کی صفت نہیں پیدا ہو سکتی۔

(6) تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ جب بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارات قائم کر کے کثیر التعداد معلمین سے ان کا پورا وقت لیا جانا ہو تو اس صورت میں یہ ذمے داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔

(7) تعلیم کے مشنری کام کو سرانجام دینے کے لیے اوپر کے اشارات کے مطابق معلم میں جہاں اپنے مخاطبین کے لیے محبت و خیر خواہی اور نرم خواہی اور نرم خوئی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ وہاں

حضورؐ کے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ خوش آئند طرز تکلم اختیار کیا جائے اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو جدال احسن سے کام لیا جائے یعنی خوش گوار انداز میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔

(8) حضورؐ کی حکمت تعلیم کا ایک تقاضہ یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقلی و ذہنی استعداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، شہری اور دیہاتی کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، مبتدی اور منتہی کے مراتب کا بھی خیال کرنا ہوگا۔

(9) حضورؐ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا۔ ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دن کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں وہلا نہ دیا جائے بلکہ انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے۔ پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد روزہ، زکوۃ اور حج کی دعوت دی جائے۔

(10) حضورؐ کی حکمت تعلیم میں ایک اصولی بات یہ ملتی ہے کہ آپ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے کہ تعلیم و خطابت کا سلسلہ اتنا بوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اکتانے لگیں، عبداللہ بن مسعود نے حضورؐ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے۔

حضورؐ کے اس اصول کی ایک شہادت حضرت ابن عباس کی طرف سے حضرت عکرمہ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ ابن عباس نے حضرت کے مسلک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں یہ تلقین کی کہ لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دو بار یا حد سے حد تین بار۔

اس اصول کی بنا پر حضورؐ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب فرماتے تھے جو تیر بہدف ہوتے تھے۔ حضورؐ کا سب سے طویل خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے۔ مگر وہ بھی اپنی جگہ بے حد مختصر ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں مختلف افراد مجالس سے حضورؐ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے، ان میں سے بعض میں ایک بات، بعض میں دو باتیں اور بعض میں چار یا پانچ باتیں ملتی ہیں۔ کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بیسیوں تلقینات اور نصیحتیں ایک سانس میں کر ڈالی گئی ہوں۔

(11) تعلیم و تدریس کے لیے طلب علم کی ذہنی فضا موجود ہونا ضروری ہے، چناں چہ حضورؐ کی معلمانہ حکمت یہ تھی کہ مجالس صحابہ میں جب تشریف لاتے تو جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہوتی، ان کا تسلسل جاری رہنے دیتے، اور خود بھی ان میں حصہ لیتے۔ تعلیمی گفتگو کے لیے آپ یا تو طلب علم کی فضا کے متلاشی رہتے جو کسی

سوال یا بحث یا اجتماعی قضیے سے از خود پیدا ہو جاتی، یا پھر خوب صورت طریقے سے ایسی فضا پیدا فرماتے۔ اسی بنا پر حضرت ابن عباس نے یہ کہا کہ جب کسی علمی مجلس کے لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے تعلیم و تبلیغ شروع نہ کردو بلکہ خاموش رہو، تا آں کہ لوگ خود ہی حصول علم کی خواہش کریں، یعنی کوئی سوال اٹھائیں۔

(12) معلّمی کا فریضہ اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک معلم اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو مرتکز نہ کرے چناں چہ حضورؐ نے توجہات کو اپنی بات کی برف مرتکز کرنے کے لیے مختلف موثر صورتیں اختیار فرمائیں، مثلاً: کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغاز کلام کیا گیا۔ جیسے یہ قرآنی پیرایۂ آغاز سورہ کہ ’’آن پہنچا اس کا فیصلہ‘‘۔

کبھی سوال سے گفتگو شروع فرماتے مثلاً کیا تم فلاں بات جانتے ہو یا کیا میں تم کو بھلائی کے راستے نہ بتاؤں؟ یا مثلاً **ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً**.

یا مثلاً خطبہ حجۃ الوداع کے آغاز میں مجمع سے دریافت کیا یہ کون سا شہر ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ کون سا دن ہے۔

کبھی کوئی حیرت زدہ منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ فرمادیتے مثلاً ’’جب آسمان پھٹ جائے گا۔ جب تارے جھڑ جائیں گے۔

اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔'' اس سلسلے میں زیادہ مثالیں پیش کرنا غیر ضروری ہے۔

(13) اصول تکرار سے بھی حضورؐ نے بارہا کام لیا۔ کسی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے تین بار اسے دہرائے۔ اسی طرح کسی کے ہاں تشریف کے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب فرماتے۔

(14) حضورؐ نے کار تعلیم کے لیے مختلف دائرے اور مختلف سطحیں مقرر فرمائیں..... ایک دائرہ عمومی تعلیم کا تھا۔

..... دوسرا دائرہ خصوصی مجالس کا تھا جن کا مقصد معیاری علما اور قائدین کو تیار کرنا تھا۔

..... تیسرا دائرہ خوتین کی تعلیم کا تھا جس کے لیے آپ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا اور جس کے لیے حضرت عائشہؓ کو مامور فرما کر لوگوں کو تلقین فرمائی کہ دین کا آدھا علم، یعنی نظام معاشرت اور خواتین کے متعلق معلومات، ان سے حاصل کرو۔

..... چوتھا دائرہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دینے کا تھا۔

..... پانچواں دائرہ باہر سے حصول تعلیم کے لیے آنے والے وفود کو تیار کر کے قبایل میں فروغ تعلیم کے لیے واپس بھیجنے کا تھا۔

(15) ''العلم'' کے علاوہ حضورؐ نے ہر قسم کے مفید علوم و فنون کے سیکھنے کی

طرف توجہ دلائی۔ نوشت وخواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی۔ صحت زبان کے اہتمام کی تلقین کی، فن کتابت کے لیے ہدایات دیں۔ صحابہ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔ میدان بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے اور آغاز جنگ کے لیے انہیں پابند فرمان بنا کر اور کوڈ ورڈز کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا بالکل نیا تجربہ شروع کیا نوجوانوں کو تعلیم جہاد دینے کے لیے دوڑ اور تیر اندازی کے مقابلے کرائے۔ عین میدان جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کو مقام جرش کی طرف بھیجا۔

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔ قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا۔ زیر تربیت رفقا کو استنذ ان کے آداب سکھائے، پراگندہ بالوں کو ترشوانے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی، عیدین کے تہوار مسرت سے منانے کے لیے جائز حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا، شادی بیاہ کے موقعوں پر اعلان نکاح کر کے مسرت آمیز انداز سکھائے اور لوگوں کو صحنوں کی صفائی کی نصیحت کی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی تربیت دی۔ نیز

خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں میں میل جول کے آداب سکھائے۔
حضورؐ کا یہ وسیع تصور تعلیم قرآن کے جس کلمۂ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھلائی حاصل کرنی ہے۔

(16) حضورؐ نے اپنی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔ قرآن حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیار انتخاب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے، اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ **فانَّ لِجسدک علیک حق.**
اس موقع پر حضورؐ کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے کہ قوی مومن کم زور مومن سے بہتر ہے۔ جسم کی ضروریات مدنظر رکھنے کا ثبوت وہ طبی تعلیم بھی ہے جو حضورؐ نے اس دور کے فن کے مطابق اپنے پیروؤں کو دی۔

(17) حضورؐ نے تعلیم کے فروغ کے لیے سوال کو یہ فرما کر بڑی اہمیت دی کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے۔ یعنی سوالات اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب معلّمی کا لازمہ ہے۔

(18) حضورؐ نے جدید دور کے فلسفیوں سے بہت پہلے اس حقیقت کو

واضح کر دیا کہ تعلیم کا آغاز مہد سے لحد ہونا چاہیے اور اس کا تسلسل لحد تک جاری رہنا چاہیے۔

(19) حضورؐ کی حکمت تعلیم کا ایک سبق یہ ہے کہ علم دیکھ کر سیکھو کہ کس سے سیکھ رہے ہو۔ یعنی آیا تمہارا معلم و استاد بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار قابلِ اعتماد ہے؟

اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ لازم آتا ہے کہ وہ معلموں کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور نہ صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے، بلکہ بلحاظ کردار ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی دور کے رکارڈ کو بھی زیر غور لائے، جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر و تشکیل کا نازک ترین فریضہ سونپا جا رہا ہو، ان کے متعلق دوسری ملازمتوں کے امیدواروں سے زیادہ چھان بین ہونی چاہیے، یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا معلّمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ ورانہ ذہنیت کے ساتھ آ رہا ہے یا اس کے اندر صحیح مشنری جذبہ موجود ہے۔ بلکہ ملازمت میں آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کا ریکاڈ زیر نظر رکھنا چاہیے اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کے لیے غیر موزوں نظر آئے اسے فوراً اس مقدس ذمے داری سے الگ کر دیا جائے۔

(20) حضورؐ ایسے علم سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو۔اس کے دو معنی ہیں ۔ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کے بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کرنا دوسرے یہ کہ بعض علوم وفنون ایسے ہو سکتے ہیں جو کوئی ٹھوس افادیت انسانوں کے لیے نہ رکھتے ہوں۔

(21) حضورؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمالات سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔مثلاً آپ نے جبر وقدر کے مسئلے پر ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصے کو لیے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصے کو اور سچائی کے دونوں حصوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا، اسی سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے نہ ٹکراؤ، واضح رہے کہ بحث ومناظرہ کی بیش تر صورتوں میں جو باعث تفرقہ وانتشار ہوتی ہے، یہی خرابی پائی جاتی ہے۔

پھر آپؐ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گم راہی کے کچھ نہیں، مثلاً یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے کہ جس کا دائرہ حقائق کے لیے ہمیں ذرائع علم دیے ہی نہیں گئے۔اس میں قدم

رکھنے سے سوائے گم راہی کے کچھ حاصل نہیں۔

(22) ایک ہدایت حضورؐ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بیش تر اہل علم اور دانش ور اپنی ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دل لوگوں کو مغالطہ دیتے ہیں۔ آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشوارانہ نکات کو علم و استدلال اور پروپیگنڈے کے زور سے ناقابل تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دل فریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں۔ پوری نوع انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے۔ ایسے دائرہائے امور غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور نہ ایسے دوائر کے لیے اسے وسائل علم دیے گئے ہیں۔

حضورؐ نے جحود بآیات اللہ، یعنی خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصان علم کا موجب بتایا۔ جس کے اثر سے سمع و بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔

(23) بچوں کے متعلق حضورؐ کی حکمت تعلیم ہمیں ایک خاص نقطۂ نظر دیتی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں۔

☆ حضورؐ نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ یہ تو جنت کے پھول ہیں۔ یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

☆ حضورؐ پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ وہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، بعد میں گھر اور معاشرے کا ماحول انہیں کسی دوسرے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

☆ میرے نزدیک فطرتِ اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کے لیے کہی گئی ہے۔ اور اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ بتاتے ہیں کہ ہر فرزند آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی، یعنی اس کے اندر خیر و شر کے دو گونہ رجحان پائے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیز خیر و شر کا میلان بھی دیا گیا ہے۔ اس ارشاد کی رو سے یہ گھر، مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے کے اندر نیکی کی ملکوتی آواز کو زوردار بنا دیں، یا بدی کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔

☆ پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں، بصورت دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اصول اجتماعی نظام تعلیم پر بھی لاگو ہوگا۔ درس گاہوں میں تمام طلبہ کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیے اور سب کے لیے حقوق و فرائض کی یکسانی کے ساتھ، اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیے۔

☆ حضورؐ کی حکمت تعلیم نے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں۔ ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دینی چاہیے جو نشان چھوڑنے والی ہو۔ سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا تھپکیاں نہیں لگانی چاہئیں۔ لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو، اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ جیسے کہ نشوز کی صورتوں میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریۂ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں

الف: تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت و شفقت ہے، سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لیے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے۔

ب: اس نظریہ سزا کے سامنے یہ حکیمانہ شعور بھی ہونا چاہیے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اس دور سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریۂ سزا بیان فرمایا۔ سنوری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں۔ اور ان پر معمولی سی سزا دینی بھی اس لیے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی

سوسائٹی میں جہاں برائی کی قوتیں حسین ودل کش اسالیب سے غلط روش کو مزین کرسامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے فکری و اخلاقی محاذ پر ایک مستقل جنگ برپا ہو، دو ہی طرز ہو سکتے ہیں یا تو اصول عام بن جائے، مشفقانہ رویہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آئے۔ یا پھر نیکی اور سچائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنادیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر مؤثر بنادے گی۔ لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

ج: سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمت عملی کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کا لحاظ ضروری ہے۔

د: بعض ایسے اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے۔ یہاں تادیب کے عصا سے مراد سچ مچ عصا نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی انداز بیان ہے جیسے کہ کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلواروں کے لفظ کے لغوی معنی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے۔ یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان کی بھلائی کے سوا کچھ

نہیں۔ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے۔تادیب یاادب سکھانا یاتربیت دینا ایک فن لطیف ہے۔

(24) حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا۔ جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع گائڈ بک ہے۔تعلیم کے بقیہ شعبے اسی مرکزی نصاب کے اردگرد مرتب ہوتے ہیں۔

(24) سرکار رسالت مآب کی حکمت تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلم کو متعلّمین کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔اسی طرح متعلّمین کے لیے لازم ہے کہ وہ معلم کا ادب واحترام رکھیں۔اس ہدایت میں یہ تقاضا ازخود مضمر ہے کہ معلم بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار اور بلحاظ معلّمانہ روش ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلبہ میں اس کے لیے احترام نشوونما پائے۔

توسیع تعلیم کے لیے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالیے جو حضورؐ نے توسیع تعلیم کے لیے سرانجام دیں: ایک طرف تو نظام صلوۃ، اس میں تلاوت قرآن اور خطبات جمعہ کا نظام بجائے خود فروغ تعلیم کا ذریعہ تھا، دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر زائد خطبات بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے۔

توسیع تعلیم کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ ہیں جو

معلم ہوں یا متعلم۔ پھر آپؐ نے قوا أنفسکم و اھلیکم نارا کے قرآنی حکم کے تحت والدین پر ذمے داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں۔ پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا ہنر عام کرنے کے لیے بدر کے قیدیوں کے لیے یہ فدیہ میں بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں۔

حضورؐ نے دور مکہ میں دار ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا، اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا۔

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صفہ نام سے مسجد نبوی میں قائم ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نو مسلم اور کچھ مقامی لوگ مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ اسے ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر احمد شلبی نے اقامتی درس گاہ قرار دیا ہے۔

اس درس گاہ میں نہ صرف قرآن کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں بلکہ لکھنے پڑھنے کا فن اور فقہ کا علم بھی سکھایا جاتا تھا۔ مسند احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق درس گاہ صفہ کے طلبہ کی تعداد ایک موقع پر ستر تک پہنچی۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ خود انہوں نے چند اصحاب صفہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی۔ اس درس گاہ کے ایک درخشندہ طالب علم حضرت ابو ہریرہؓ تھے۔

حضورؐ کے توسیع علم کے منصوبے کا ایک اہم جز یہ تھا کہ ہر مسجد مرکز

تعلیم بھی تھی خود حضورؐ کے دور میں مدینہ میں نو مسجدیں ایسی تھیں جہاں بڑوں اور بچوں کو دین اور قرآن کی اور معاملات زندگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

توسیع تعلیم کے لیے حضورؐ مختلف قبائل کی طرف قرّاء کو بھجواتے۔ واضح رہے کہ درس گاہِ صفہ کے فارغ التحصیل قرّاء کہلاتے تھے۔ قرّاء قاری کی جمع ہے، مگر یہ لوگ آج کل کے معنوں میں قاری نہ ہوتے تھے بلکہ تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ فہم قرآن اور تفقہ فی الدین میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ یہ قرّاء فوجی دستوں کے ساتھ بھی علاقوں میں بھجوائے جاتے۔ تاکہ وہ خود مجاہدین کی تعلیم کا سلسلہ سفر میں بھی جاری رکھیں۔ اور اگر کوئی قبیلہ اطاعت قبول کرے تو اس کے لوگوں کو تعلیم دیں۔

درس گاہ صفہ کے ذریعے ان قرّاء کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ ایک مرتبہ ستر قاریوں کا قافلہ علاقہ نجد کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان قیمتی ہستیوں کو بئر معونہ کے مقام پر ان فریب کار بدویوں نے شہید کر دیا جنہوں نے خود ہی درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا۔

جن ممتاز صاحب علم شخصیتوں کو حضورؐ کسی مقام پر اپنا عامل یا نمائندہ بنا کر بھیجتے ان کے ذمے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کام بھی کرتے چناں چہ بنی حارث کی طرف خالد بن ولید کو بھیجا گیا تو ان کو تعلیم کی ذمے داری سونپی گئی۔ اسی طرح عمرو بن حازم عامل یمن کو حضورؐ نے تحریری ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھائیں، اس میں تدبر و تفکر کی تربیت

دیں اور انہیں آگاہ کریں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ اور ان پر فرض کیا عائد ہوتے ہیں۔

سورۂ توبہ کی آیت 122 کے مطابق مختلف نو مسلم قبائل کے وفود مدینے میں آکر قیام کرتے اور حضورؐ اور صحابہ کرام سے علم حاصل کر کے واپس جاتے اور اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے۔ اس قسم کا ایک وفد مالک بن الحویرث کی سرکردگی میں مدینے آکر 20 روز تک مقیم رہا۔

بعض خاص مواقع پر حضورؐ نے خصوصی معلمین کا تقرر فرمایا۔

مثلاً سب سے پہلی مثال ہجرت سے قبل کی ہے جب کہ آپؐ نے اہل مدینہ کے لیے سعد بن العاص کا تقرر بہ طور معلم فرمایا اور انہیں مامور کیا کہ وہ دین سکھانے کے علاوہ لوگوں کو لکھنے کی تعلیم دیں۔ واضح رہے کہ حضرت سعد خوش نویس تھے۔ انے متعلق لمجرّ کی روایت یہ کہ انہیں معلم کا لقب دیا گیا۔

اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضرت معاویہؓ کو مکہ کے نو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔

ان مساعی کے واضح نتائج تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

وہ قوم قریش جس کے ہاں اسلام سے پہلے جملہ 17 آدمی نوشت و خواند جانتے تھے۔ ان کے نبی کے گرد مدینہ میں کاتبان وحی اور محرران مکاتیب کا ایک وسیع سکریٹری ایٹ موجود تھا۔ مردوں کا معاملہ الگ

رہا۔5 خواتین بھی لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں اور یہ تھیں: (1) حضرت حفصہ بنت عمرؓ (2) حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ (3) حضرت عائشہ بنت سعدؓ (4) حضرت کریمہ بنت مقدارؓ (5) حضرت الشفاء بنت عبداللہ عدویہ جو حضرت حفصہ کی استاد تھیں۔ قرون اولی میں 1543 محدث خواتین تھیں۔

آہستہ آہستہ اہل تخصص (specialist) پیدا ہوئے جب کہ حضورؐ نے علم فرائض میں زید بن ثابت کو، قرآن خوانی اور تجوید میں ابی بن کعب کو، حرام و حلال کے احکام کا علم رکھنے میں حضرت معاذؓ بن جبل کو مرتبہ اوّل پر شمار کیا۔ اسی طرح ایک موقع پر فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو: عبداللہ بن مسعود سے، سالم مولیٰ ابوحذیفہ سے، ابی بن کعب سے۔

کتنا حیرت ناک واقعہ ہے کہ یہ تیز رفتار تعلیمی سرگرمی ایسے حالات میں روبعمل آئی جب کہ مسلسل ایمرجنسی کا دور تھا اور مدینے کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کثیر التعداد دشمنوں کے حملہ ہائے مسلسل کی زد میں تھی۔ بات یہ ہے کہ اصل چیز تو یہ تعلیم دین ہی تھی جس کے بل پر ریاست کھڑی تھی اور جس کی دی ہوئی سپرٹ مسلمانوں کو معرکہ ہائے کارزار میں اپنے سے بڑی طاقتوں پر فتح دلا رہی تھی۔ اس تعلیم کے کام میں اگر کوتاہی رہ جاتی تو پھر اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

دوسرا بڑا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ''العلم'' کے ساتھ ساتھ مختلف دنیوی علوم وفنون میں بھی مسلمانوں میں نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیئت،

نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، تزئین، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، صیقل گری وغیرہ میں صدی دو صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ ان کی علمی قوت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرہ اثر میں لے لیا۔

تیسرا سبق آموز نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی شروع کی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری، تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا، پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیل نو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج جب کہ علمی پس ماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و رتہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملت اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کم زور ہوگئی ہے۔ ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت اطمنان سے شکست کھا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

کلمۂ آخر

آیئے، اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر آ کر ہمیں اپنی ضرورتوں کے

سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظام تعلیم ہم پر مسلط کیا جو ملت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا۔ نبی اکرمؐ کی حکمت تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظام تعلیم کے تیزاب میں ہماری اس طرح تحلیل ہوگئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نجات نہیں پا سکتے۔

کار پردازان تعلیم کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اب تک جو کچھ سوچا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ اس مسلط شدہ نظام تعلیم کے نصابیات میں چند اچھی باتیں اسلام کی بھی داخل کر دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی ٹینک میں چند پرزے شکر سازی کی مشین کے فٹ کر کے یہ سمجھیں کہ اب یہ ٹینک شکر بنانے لگے گا۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علم بردار ملت اور تحریک فلاح انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پورا نظامِ تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے وہ نصابیات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے۔ وہ اپنی حکمت تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظام حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔

میں ملک کے ذی شعور معلّمین اور ماہرین کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ بنی

اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملت اسلامیہ کے لیے ایک صحت مند نظام تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلاف ایمان اور خلاف مزاج نظام تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔